Methodology Underlying Imam Ghazali's Critique of Greek Philosophy

فلسفہ یونان کا ابطال: امام غزالی کا طریقہ کار

علی محمد رضوی

مشہور فلسی و فلسفہ مغرب کے ناقد علی محمد رضوی کے علمے مقالے کے اس ترجمے کے لیئے ہم ماہنامہ ساحل کے مشکور ہیں۔ جو اول انگرئزی زبان مہں موقر علمی جریدہ ،جریدہ ،جامعہ کراچی میں ۔،جلد :۲۹ میں طبع ہوا تھا ،جس کو ۔۔کرف۔۔أن لائن انگیزی ایڈیشن کی صورت میں پیش کر چکا ہے ۔جناب :ریحان احمد اس کے ترجمے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۹۔۔مئی ۔۔۲۰۱۶

ساحل انجتر [۲۹] ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

صفحات :69-92

www.kurf.page.tl

www.facebook.com/kurf.ku

majunaid@live.com

فلسفہ یونان کا ابطال: امام غزالی کا طریقہ کار

مغربی فلسفے کو غزالی بنیادوں پر مسترد کر دیا جائے

علی محمد رضوی

ترجمہ: ریحان احمد

ا۔تعارف:

اس مقالہ کو ضابطۂ تحریر میں لانے کا مقصد ان منہاجیاتی اصولوں کی تفہیم کی کوشش ہے جو مغربی فلسفہ اور بالخصوص یونانی مابعد الطبعیات کی تنقید سے متعلق امام غزالی کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔اس مطالعاتی جائزہ کو ہم کئی حصوں میں منقسم کر کے دیکھ سکتے ہیں مثال کے طور پر

۱) اس تناظر سے مکمل واقفیت حاصل کی جائے جس کے تحت امام غزالی یونانی فلسفہ کی بنیادوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں کیوں کہ اس سے ہمیں امام غزالی کی تنقید کے بنیادی محرک کو جاننے میں بھی مدد ملے گی۔

۲) اس دور میں مختلف افکار ونظریات اور عقائد واعمال کی جانب سے درپیش مختلف النوع خطرات کا تجزیہ اور ان کا سد باب۔اس ضمن میں آپ کے اصول وتفریقات اہم ہیں۔

۳) فلسفہ ومنطق کے وہ عمومی اصول جو استدلال کے دوران امام نے استعمال کیے اور ان کی کس طرح توجیہہ بیان کی۔

۴) پھر وہ خاص اصول جو یونانی مابعد الطبیعات کی رد تشکیلیت کے سیاق میں امام نے نہایت عمدگی سے استعمال کیے۔

۲۔ امام غزالی کے فکری کام کی اہمیت:

ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام کی منہاجیات کا مطالعہ کیوں ضروری ہے اس سوال کے جواب کے لیے مشہور مستشرق منٹگمری Watt کا تبصرہ قابل غور ہے۔

''مشرق ومغرب امام غزالی کے فکری مقام کی بُلندی کے اس درجہ قائل ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد امام کو سب سے بڑا مسلمان گردانتے ہیں اور آپ بجا طور پر اس مقام کے مستحق بھی ہیں آپ کی شخصیت کی بلندی کے بیان میں جہاں دیگر پہلوؤں کو پیش کیا جاسکتا ہے وہاں یہ دو بالخصوص قابل ذکر ہیں فلسفۂ یونانی کے ساتھ مجادلہ عظیم کے دوران آپ فکر اسلامی کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور یقیناً اسلامی فکر اس پیکار سے نہ صرف یہ کہ فاتح بن کر نکلی بلکہ فکری سطح پر اسے مزید استحکام بھی ملا اور مغربی نوافلاطونیت کی فکر پر ایسی کاری ضرب لگی کہ جس سے وہ پھر سنبھل نہ سکی۔ آپ کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے شریعت اور طریقت کے درمیان خلیج کو پاٹنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور دونوں گروہوں کے راہنما قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے حالانکہ علمائے شریعت اور پیران طریقت دونوں اب بھی اپنے اپنے افکار و اقدار کو ہی برتر تصور کرتے تھے لیکن دونوں فریقین ایک دوسرے کے مقام کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نظر آتے تھے علمائے شریعت صوفیاء کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے جب کہ دوسری جانب صوفیاء شرعی پابندیوں کے معاملے میں زیادہ محتاط رہنے لگے۔''
[Intro pp.14-15]

آج اسلام کو مغربی فکر کی جانب سے ویسی ہی صورتحال درپیش ہے جو کسی زمانے میں یونانی فلسفہ کے ساتھ تھی اور آج اس کڑے دور میں مغربی علوم کے احیاء کی اسی قدر ضرورت ہے جیسا کہ امام غزالی کے وقت میں تھی اور اگر آج اہل اسلام اس موجودہ نازک صورتحال سے کامیابی سے نکلنے کے خواہش مند ہیں تو انھیں امام غزالی کی فکر کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔[Ibid P.15]

مغربی فکر کی جانب اب تک مسلمانوں کے بالعموم دو طرح کے رویے سامنے آئے ہیں، ایک صورتحال یہ نظر آتی ہے کہ علماء کی اکثریت اور ان کے پیروکاروں نے مغربی فکر سے ہمیشہ دامن بچانے کی کوشش کی ہے تا کہ اسلامی فکر کو مغربی فکر کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے، دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ جدیدیت پسندوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا ہے جس نے صراحتاً اس امر کی کوشش کی کہ یا تو ہر دو افکار کے درمیان تطابق وتفاہم کے رشتہ کو سامنے لایا جائے یا پھر اسلامی فکر کی مغربی حیثیت کو مغربی اصول تنقید اور منہاجیات کی مدد سے جانچا جائے۔

مغربی فکر کے ساتھ جدال کی اس کیفیت کے دوران جس شے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ غیر اسلامی افکار کا غزالی کے منہاج فکر کی روشنی میں جائزہ لینا اور اس کا محاکمہ کرنا ہے۔ آج امام غزالیؒ کی فکر سے رجوع کرنے کا مقصد و غایت بھی یہی ہے کہ مغربی فکر و عقائد کو سمجھنے کے لیے قدیم اسلامی اصول تنقید کو ترویج دی جائے۔

جدوجہدِ امام غزالی کی غایت وتناظر:

امام غزالی کی عظیم کاوش کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تناظر سے واقفیت حاصل کی جائے جس میں مغربی فکر کے محاکمہ کی ضرورت کا احساس دوچند ہوا صورت حال کچھ یوں تھی کہ اسلامی سلطنت کی توسیع کے دوران رومی، یونانی تہذیب سے ٹکراؤ وہ پہلا ٹکراؤ تھا کہ جب مسلمانان عرب انسانوں کے ایک ایسے گروہ سے برسرِ پیکار ہوئے جو ان تہذیبوں کے مقابلے میں تصور حق کے لیے متبادل فکری دلائل رکھتے تھے اس

سے قبل تک جن اقوام سے مسلمانوں کا واسطہ پڑا تھا ان میں ایک کفار تھے جو اپنے عقائد کے لیے کسی قسم کی علمی بنیاد نہیں رکھتے تھے یا یہود و نصاریٰ کے گروہ تھے جو اسلام کے مماثل علمیات کے قائل تھے۔

ہر چند کہ یہ ٹکراؤ امام غزالیؒ کے زمانے سے دو صدی قبل سے جاری تھا لیکن آپ کے عہد میں اس تہذیبی ٹکراؤ سے برآمد ہونے والے علمی و فکری مسائل نے امت مسلمہ کے لیے ایک فتنہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور علماء میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے تدبر و تعقل کی بنیاد پر خود کو برتر تصور کرنے لگے تھے اس کے علاوہ وحی کو حق وصداقت کا منبع سمجھنے کے بجائے عقل و خرد کو صداقت کے حصول کا ذریعہ سمجھ رہے تھے۔ وحی کے لیے ان کا حقارت آمیز رویہ ان کے اسلامی طریقوں اور علامات کی دستبرداری سے ظاہر ہوتا تھا۔ اُمت کو درپیش اس نازک و پرفتن صورتحال کو امام غزالیؒ یوں بیان فرماتے ہیں۔

> ''انھوں نے وہ تمام پابندیاں ترک کر دی ہیں جو اسلام اپنے پیروکاروں پر کرتا ہے۔ وہ دین کے ان احکامات کی ہنسی اُڑاتے ہیں جن میں طرائق بندگی اور حلال و حرام کے قوانین بیان کیے گئے ہیں وہ الہامی و شرعی قوانین کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اپناتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ شریعت مطہرہ کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کو مطلق بجا نہیں سمجھتے بلکہ خود عقائد و ایمان کو مختلف النوع قیاسات کی کسوٹی پر پرکھنے لگے ہیں ان کی مثال دراصل ان لوگوں کی ہے جو خدا کے رستے سے بھٹک جاتے ہیں اور شیطان کی راہ پر چل نکلتے ہیں اور جو آخرت کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے''۔

امام اس نازک صورتحال کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ بیرونی فلکر کس طرح عام مسلمان کے عقائد و اعمال پر اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ علمیاتی معیارات میں یہ تبدل و تغیر، جو وحی سے عقل و خرد کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بالخصوص کفریہ عقائد کے فروغ کے ضمن میں راہ ہموار کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔

آج ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہاں سقراط، بقراط، افلاطون وارسطو وغیرہ کو علمیاتی شخصیات کے طور پر غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اور ان فلاسفہ کے مقلدین مبالغہ کی حد تک انھیں مافوق الفطرت تدبر کے حامل افراد کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان عظیم عقلی صلاحیتوں کے بل پر جو اصول دریافت کیے گئے ہیں وہ کسی بھی قسم کی لغزش سے پاک اور ناقابلِ تغیر ہیں اس کے علاوہ ریاضیاتی، منطقی، طبیعیاتی اور مابعد الطبیعاتی علوم کو بھی نہایت مکمل و جامع حیثیت میں پیش کیا ہے اور اس کے پس پشت وہ عظیم ترین عقلی صلاحیتیں ہی تھیں جن کی بنیاد پر استخراجی طریقہ کار کے ذریعے کائنات کے پوشیدہ حقائق کو دریافت کیا گیا اور تدبر و تعقل کی ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر انھوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ مذہبی احکامات محض بے بنیاد مفروضوں اور غیر اہم حقائق سے متعلق بیانات کا مجموعہ ہیں اور انھیں کسی بھی قسم کی برتری کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

درج بالاسطور اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ہمیں اُن وجوہات واسباب کے بارے میں پتا چلتا ہے جو امت مسلمہ میں کفریہ عقائد کی ترویج کا سبب بن رہے تھے ان اسباب کو نمبر وار یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ذہنی و علمی برتری کے سبب فلاسفہ کو ہر ذی نفس بشمول انبیاء کرام سے بھی برتر سمجھنا۔

۲۔ فلاسفہ کے دریافت کردہ اصولوں کو غیر مشکوک اور بدیہی تصور کرنا۔

۳۔ استخراجی طریقۂ کار کو ایسی منہاجیات کے طور پر تصور کرنا جس کے ذریعے بدیہی اصولوں سے نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

۴۔ نتیجتاً یونانی مابعد الطبیعات منطق اور طبیعی علوم کی برتری پر یقین

۵۔ درج بالا عوامل مذہبی احکامات و تعلیمات کی تحقیر و تذلیل کا سبب بنتے ہیں۔

درج بالا نکات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ان فلاسفہ کے مقلدین کے اندر ایک تکبر پیدا ہو گیا جس نے یونانی فلاسفہ، ان کی منہاجیات، علمیات میں تکبّر پیدا کیا۔ جس کا مربوط اور مسطوط محاکمہ کرنے کے لیے امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ جیسی کتاب تصنیف کی۔ آپ خود اس مقصد کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

''خرد سے عاری ان افراد کو جب میں نے اس فکر کو اپناتے ہوئے دیکھا تو یہ فیصلہ کر لیا کہ قدیم فلاسفہ کی فکر کے رد کے لیے ایک کتاب لکھنی چاہیے جو ان کے عقائد کی بے ربطی اور ان کے مابعد الطبیعاتی نظریات کی کجی کو واضح کر دے گی اور ان کی فکر کے کمزور ترین گوشوں کو اس طور پر عیاں کر دے گی کہ کچھ لوگوں کے لیے تفریح طبع کا سبب بنے گی تو کچھ لوگوں کی عقائد کی درستگی بھی''۔ اشارہ عقائد کے ان حصوں کی جانب ہے جن کی بنیاد پر وہ اپنے تئیں خود کو دوسروں سے ممتاز و برتر تصور کرتے ہیں۔

۴۔ امام غزالی کا نظریہ علم اور مختلف علوم کی تقسیم:

علم کیا ہے اور اس کا حصول کن مقاصد کے تحت کیا جانا چاہیے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جنہیں امام غزالی کی فکر میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے علاوہ تنقید کے عمومی مقصد کو سمجھنے کے لیے بھی یہ سوالات نہایت اہم ہیں ابتداً علم اور حصول علم کی غایت سے متعلق کچھ ایسے تصورات و نظریات کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر آپ نے مغربی فکر کی تنقید مرتب کی ہے۔

آپ کی نظر میں حصول علم کا مقصد (اس سے تصور علم کو بھی واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے) دو طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے (۱) معاد، (۲) معاش۔ ان ہر دو مقاصد میں ایک نوع کا گہرا تعلق موجود ہے کہ معاد کا فروغ حلال رزق کے حصول کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا مطمع نظر معاد کا حصول ہونا چاہیے اور معاش کے حصول میں سرگرمی فقط اس وقت تک مستحسن ہے جب تک وہ معاد کے حصول میں معاون ثابت ہو۔ اسی طرح وہ تمام علوم جو معاد کے حصول کے لیے وضع کیے گئے ہیں یقینی طور پر علم کے دائرے میں آتے ہیں اور نہ کسی بھی طرح اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتے ہوں۔ لہٰذا اصل علم معاد کا علم ہے اور بقیہ تمام علوم کی حیثیت اسی ایک معیار کی بنیاد پر جانچا و پرکھا

جائے گا۔امام غزالی طالبانِ صداقت وعلم کی توجہ خاص طور پر اس نکتہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''حصول علم کے لیے اس قدر شدید طلب رکھنے والے میرے دوست تم جو خود کو یہ احساس دلا رہے ہو کہ طلب علم کی راہ میں کس قدر صادق، پُر جوش اور مستقل مزاج ہو کیا تم نے اس امر پر غور کیا ہے کہ اس جستجوئے علم کے پس پشت کیا مقصد کارفرما ہے اگر تمہارا مقصد اپنی ذات کا نفع اور اپنے ہم جماعتوں میں ممتاز حیثیت کا حصول ہے تا کہ لوگوں کی توجہ حاصل کر کے دنیاوی نعمتیں سمیٹ لو تو جان لو کہ تم اپنے مذہب کے لیے بے فائدہ و بے کار ہو تم خود کو تباہ و برباد کر رہے ہو تم نے ابدی زندگی کو اس عارضی آرام وسکون پر قربان کر دیا ہے اور خوب سمجھ لو کہ یہ سودا خسارے کا سودا ہے اس بے سود تجارت میں کچھ نفع نہیں اور تمہارا استاد جو تمہیں اس گمراہی میں پختہ کار کرتا ہے وہ بھی اس خسارے میں برابر کا شریک ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو ایک مسافر کو تلوار فروخت کرتا ہے۔

دوسری جانب اگر جو یائے علم وصداقت کے ضمن میں تم یہ نیت رکھتے ہو کہ فقط بڑائی ظاہر کرنے کے لیے کچھ الفاظ نہ سیکھے جائیں بلکہ صحیح راہنمائی حاصل کی جائے تو خوش ہو جاؤ کہ یہی درست راہ ہے۔ [TBG p.86]

سطور بالا سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حصول علم کا مقصد ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی اور علم دراصل خشیت الٰہی کا احساس ہے یہاں علم اور معلومات کے درمیان بھی ہمیں واضح فرق دکھائی دیتا ہے کہ فقط کچھ حقائق جان لینے کا نام علم نہیں ہے بلکہ الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے جو رضائے الٰہی کے حصول میں ممد ومعاون ثابت ہو اور خوفِ خُدا پیدا کرے امام غزالی کے مطابق علم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس گفتگو کی روشنی میں ہم علوم کو بہ اعتبار درجات درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱) ایسے علوم جو کلی طور پر راست معاد سے متعلق ہیں مثلاً قرآن وحدیث کے علوم

۲) وہ علوم جو معاد کے لیے ضروری ہیں ان کے جاننے کا مقصد فقط ان علوم کو جاننا نہیں ہوتا بلکہ معاد کا حصول ہوتا ہے اور اگر ان کو صرف ان کا علم حاصل کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ علوم مضر ثابت ہوتے ہیں۔مثلاً عربی شاعری کی تعلیم قرآن کریم کی تفہیم میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

۳) ایسے تمام علوم جن کا معاد سے کسی طور پر واسطہ نہیں ہے جنہیں کلیتاً رد کرنے کی ضرورت ہے۔یہ صراط مستقیم کے بجائے گمراہی وضلالت کی طرف لے جاتے ہیں، یہ شیطانی علوم ہیں جس کا حاصل کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے امام غزالی نے اس سیاق میں یونانی مابعد الطبیعات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

۴) ایسے علوم شامل ہیں جو کلیتاً نہیں بلکہ آلاتی طور پر معاد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں جن کو بحیثیت مجموعی رد نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو شیطانی علوم کی معاونت کے جواز میں رد کیا جاتا ہے اس ضمن میں یونانی منطق کو مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

۵) ایسے تمام علم جو معاد کے حصول کی راہ میں نہ تو کسی بھی طرح سودمند ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ ضرر رساں قرار دیے جا سکتے ہیں۔ان کا رد کیا جانا نبی اکرم کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے جس کا مفہوم

یہ ہے کہ مومن کے ایمان کا حسن یہ ہے کہ وہ فضول و بے کار افعال سے اُلفت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر وہ علوم پیش کیے جا سکتے ہیں جنہیں ہم آلاتی علوم کہتے ہیں اور جو معاونت کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

درج بالا تقسیم کے حوالے سے کلیت اور آلائیت کی کیفیات کے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن بنیادی درجہ بندی وہی رہتی ہے۔

۵۔ امام غزالی کی یونانی علوم پر تنقید:

علم کی یہ تعریف و مفہوم اس کی درجہ بندی اور عمومی اصولوں کے سیاق کو سامنے رکھتے ہوئے امام غزالی مختلف یونانی علوم کا نہایت بسیط محاکمہ پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی علمیاتی تناظر میں ان کا صحیح مقام بھی مرتب فرماتے ہیں۔ زیریں سطور میں مختلف یونانی علوم پر امام کی تنقید کو مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

منطق:

امام غزالی کی رائے میں منطق ایک آلاتی علم ہے اس میں استدلال کے مختلف طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور مباحث کے ایسے اصول سکھائے جاتے ہیں جنہیں ہر دو فریقین میں سے کوئی بھی اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ اندازِ استدلال اور اصول جو کسی بھی استدلال کو مضبوط و قوی بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں دراصل صرف قضایا کی ساخت سے گفتگو کرتے ہیں انھیں قضایا کے معنی و مفہوم سے کچھ بحث نہیں ہوا کرتی۔ اسلام منطق کو بطور آلہ علم رد نہیں کرتا اور نہ ہی اسے رد کرنے کی کوئی ضرورت ہے کیوں کہ اگر فلاسفہ منطقی طریقہ کار کو استعمال کر سکتے ہیں تو حامئین اسلام کا گروہ بھی اپنے مؤقف کی مضبوطی ثابت کر دینے کے عمل کو غیر ضروری متصور کرتے ہیں لیکن انسانی عقل پر بے جا اعتماد کو خرابی کی وجہ سمجھتے ہیں کہ یہی وہ راہ ہے جو مذہبی احکامات پر شک و انکار تک جاتی ہے۔

یہ تن تنہا آپ کی ذات والا صفات ہی کا کارنامہ تھا کہ آپ نے اُس وقت کی موجود منطقی باریکیوں کو نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر سمجھا بلکہ ان کی مدد سے غیر اسلامی عقائد میں موجود بے ربطی اور کجی کو بھی واضح کر دیا۔ امام اس صورتحال کو یوں بیان فرماتے ہیں: ''جہاں تک اس تنازعے کا تعلق ہے کہ منطقی اصولوں و ضابطوں کے بغیر کوئی بحث مکمل نہیں ہوتی ان کا یہ مؤقف بالکل درست ہے لیکن یہ بھی اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے کہ منطق اُن کی اجارہ داری نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ وہی شے ہے جسے ہم فن علم الکلام میں کتاب 'تحقیق نظری' کے نام سے موسوم کرتے ہیں فلاسفہ نے اسی کا نام تبدیل کر کے منطق رکھ دیا ہے اور اس کے بارے میں ایسا تصور قائم کر دیا ہے کہ عوام اس کے نام سے ہی مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ علم کی کوئی ایسی شاخ ہے جس سے متکلمین کلی طور پر ناواقف ہیں اور صرف فلاسفہ ہی منطقی موشگافیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں''۔ [Tp.10]

امام غزالی علم منطق کے منفی پہلوؤں سے اجتناب برتنے کی بارہا تلقین کرتے ہیں اور اس سے متعلق

خوش فہمیوں کا بھی نہایت عمدگی سے پردہ چاک کرتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ان حدود کو سمجھنا چاہیے جو بات منطقی اصول اپنی جادوگری دکھا سکتے ہیں۔نکتہ یہ ہے کہ منطق صرف دو قضایا کے درمیان تعلق کی نوعیت کو مکمل یقین کے ساتھ بیان کرنے کی اہلیت رکھتی ہے جس کو اقتباساً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ ان قضایا کے معنی ومفہوم سے متعلق بھی قطعیت کے ساتھ رائے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

امام فرماتے ہیں ''ایک عام معارف جس میں عموماً طالبان منطق گھرے ہوئے پائے گئے ہیں کہ وہ اس علم کی بنیاد پر کچھ ایسے معیارات وضع کر لیتے ہیں جن پر پورا اُترنے والے قضایا کو بھی صحیح و درست تصور کیا جاتا ہے اور جب وہ انہی معیارات کے ساتھ مذہبی احکامات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں دقّت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ مذہبی احکامات ان معیارات پر پورے نہیں اُترتے لیکن وہ اپنے طے کردہ معیارات کے ضمن میں یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں مزید غور وفکر کی گنجائش ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے کہ مذہبی بیانات بدیہی حیثیت کے حامل نہیں ہوا کرتے لہٰذا ان کا اثبات وانکار بھی کرنا ممکن نہیں ہے سوائے اس صورت کے کہ اس کو استدلال کی صورتوں کے تبدل کے حوالے سے نہ جانچا جائے بلکہ ان عقائد ونظریات کے حوالے سے پرکھا جائے جو ہر دومخالف صورتوں میں پائے جاتے ہیں جو منطق کے بجائے مابعد الطبیعات اور اس جیسے دیگر علوم کا میدان ہے۔ چنانچہ وہی لوگ اس مغالطہ میں گھرتے ہیں جو ساخت اور مفہوم کے اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ''کفر یہ عقائد جن کا فلاسفہ اپنی فکر میں اظہار کرتے ہیں۔منطق کے اصول ومعیارات پورے اُترتے ہیں اور اس طرح وہ ان عقائد کی برتری پر بھی ایمان لے آتے ہیں۔

امام بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ منطق کا کوئی بھی اصول چاہے وہ قیاس کی مادی صحت جانچنے سے متعلق ہو یا اس کی صفوی صحت سے بحث کرتا ہو یا وہ مفروضہ ہی کیوں نہ ہوں جو منطق کی عمارت کے نہایت اہم ستون ہیں کسی بھی نوعیت کی تکنیک مابعدالطبیعاتی علوم کی بحث میں ان کی معاونت کرنے کی اہل نہیں ہے۔[Tp.10]

ریاضی:

ریاضی ایک آلاتی علم ہے جو دیگر مقاصد کے حصول میں معاونت کا کام کرتا ہے اور کئی علوم میں اس کی ضرورت نہایت اہم ہے مثلاً میراث سے متعلق مسائل کی تفہیم کے سلسلے میں علم ریاضی مفید ہے یا نماز کے اوقات معلوم کرنے کے لیے بھی اس علم کا استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن اس سے قطع نظر دو خطرات ایسے شدید ومہلک ہیں کہ جنھیں علم ریاضی کے سیاق میں بالخصوص اور دیگر علوم میں بالعموم سمجھنا چاہیے۔

ا۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ علم الحساب کی قطعیت اور اظہار بیان کی ندرت کو دیکھ کر عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے تمام علوم ریاضی سے مشابہہ صحت کے حامل ہیں جس خدشہ کو مکمل سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا جانا چاہیے وہ یہ کسی اس کائنات سے متعلق وہ حقائق جن کے بارے میں مختلف آراء موجود رہی ہیں اور بہت سے اذہان بھٹک

کر گمراہ ہو گئے۔

تہذیبوں کے درمیان تصادم اور تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کو درپیش علمی مسائل کے حل کے لیے امام غزالی ایسا کلیہ پیش کرتے ہیں کہ جس سے تشفی بخش جوابات کی تلاش میں بہت مدد ملے گی ''ایک ایسا شخص جو کسی فن میں مہارت حاصل کرتا ہے اور اس میں نام پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر فن میں اسی قابلیت کا حامل ہے۔ایسا نہیں ہے کہ ایک شخص جو قانون والٰہیات کا نہایت عمدہ عالم ہے اور اس کی باریکیوں کو بہت عمدگی سے سمجھتا ہے تو وہ فن طب کے اصولوں سے بھی واقف ہوگا یا فلسفہ و دیگر عقلی علوم سے ناواقف شخص قواعد (گرامر) کے اصولوں سے بھی نابلد ہوگا۔ ہر علم کے کچھ ایسے ماہرین ہمیشہ موجود ہوتے ہیں جو کہ ایک فن میں ماہر ہوتے ہیں مگر دوسرے فن کے لیے مطلق جاہل ہوتے ہیں''۔

سطورِ زیریں میں امام غزالی علمِ ریاضی اور دیگر علوم کے مابین تفریق نہایت وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''ریاضی کے بنیادی اصول اپنی ماہیت میں اظہاری ہیں جب کہ الٰہیات (مابعد الطبیعات) کی بنیاد قیاسات پر ہے جو اہل علم ان علوم کا غائر مطالعہ کر چکے ہیں وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں''۔اسلام اور سائنس کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ اہم ہے اسلام اور سائنس کے درمیان بنیادی طور پر کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن مسائل وہاں جنم لیتے ہیں جب سائنس اپنی تحدیدات نظرانداز کرتے ہوئے مابعدالطبیعات والٰہیاتی مباحث کو اپنے عمومی اظہاری طریقوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اس کے علاوہ سائنسی فکر اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ زندگی کے اسرار ورموز کلی طور پر سمجھنے میں اس کی رائے کو مقتدر و محترم سمجھا جائے اور اس طرح علمائے دین کی رائے کو سائنسی فکر کے تابع کر دیا جائے۔لیکن امام کا قول اس قضیہ کو یوں مٹاتا ہے کہ کسی ایک فن میں مہارت تامہ رکھنے والا شخص دوسرے فن میں اسی مقام و مرتبہ کا حامل نہیں ہوسکتا یعنی مابعد الطبیعاتی اور الٰہیاتی مباحث میں سائنس کی رائے کسی طور بھی اہم و برتر متصور نہیں ہوسکتی لیکن ایسے افراد جو ان ہر دو فکری مقامات میں فرق نہیں کر سکتے وہ مابعدالطبیعات والٰہیاتی معاملات میں سائنس کو اس کی دیگر مخصوص شعبوں میں برتری کے سبب مقتدر و محترم تسلیم کر لیتے ہیں اور اس رویہ کی بدولت صراط مستقیم سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں علم ریاضی کے حصول کے بارے میں امام کی قطعی رائے یہ ہے کہ

''وہ طلباء جو ریاضیاتی علوم کا نہایت دلجمعی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں انھیں اس سے روک دینا چاہیے چاہے وہ اسے مذہبی معاملات کی تفہیم میں نہ بھی استعمال کریں لیکن چونکہ یہ فلسفیانہ علوم کی بنیاد ہے اس طرح طالب علم فلاسفہ کی فکری بدعقیدگیوں اور انتشار ذہنی کا شکار ہوسکتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا ذہن خشیت الٰہی کے تصور سے خالی ہو جاتا ہے۔

ریاضی اور سائنس کے حوالے سے دوسرا خطرہ افراد کا وہ گروہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ''فلاسفہ کے

دریافت کردہ ہر علم کے رد کے ذریعے ہی مذہب کا دفاع ممکن ہے اور اس طرح وہ ان کے تمام علوم کا انکار کرتے ہیں اور خود کو جہالت کی عمیق گہرائیوں میں لا پھینکتے ہیں یہ رویہ مذہب اسلام کے لیے کسی بھی طرح سے سودمند قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ اس سے یہ باطل تصور نکلتا ہے کہ اسلام کی بنیاد حقائق سے انکار پر ہے جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے امام فرماتے ہیں ''وہ شخص اسلام کا شدید دشمن ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا دفاع ریاضیاتی علوم کے انکار کے ذریعے ہی ممکن ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ ان علوم کے مقابلے میں الہامی تعلیمات تہی دامن ہیں اور یا پھر یہ کہ مذہبی صداقتوں کے مقابلے میں یہ علوم طفلانِ شیرخوار ہیں''۔

فطری علوم Natural Sciences:

امام فطری علوم کو علم طب کے مماثل سمجھتے ہیں کہ جس طرح طب میں انسانی جسم سے متعلق تحقیق و جستجو کی جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش ہے اور اسلام طبی علوم کو رد نہیں کرتا لہٰذا فطری علوم کا رد بھی اسلام کے لیے لازم نہیں ہے لیکن ان علوم کے اس تصور کو پسندیدہ نہیں سمجھتے جو یونانی فکر کے بطنِ بطون سے نکلتی ہے اور اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ فطرت پسندی کا نظریہ ان علوم کا استخراج نہیں ہے بلکہ یہ ایک مابعدالطبیعاتی تصور ہے جو ان علوم کو تفہیم میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اس تصور کی اصلاح کی ضرورت ہے کہ فطرت آپ اپنی مالک نہیں ہے بلکہ ایک مخلوق و واسطے کے طور پر اپنے افعال انجام دے رہی ہے۔ چاند سورج، ستارے و سیارے سب اُس کی طابع ہیں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو آپ اپنی مرضی کی مالک اور بدیہی طور پر وجود رکھتی ہو۔

المختصر کسی بھی سائنسی نظام فکر کے پس پشت مابعدالطبیعاتی تناظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور انھیں نہ صرف یہ کہ تعدیلی اہمیت کا نہ سمجھا جائے بلکہ یہ بھی اچھے طریقے سے جان لینا چاہیے کہ کسی بھی سائنسی نظام میں موجود عمومی حقائق کو ان سے جدا کر کے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اسلام فطری علوم کی حیثیت پر کارفرما یونانی فکر کو تو تنقید کا نشانہ بناتا ہے لیکن تجرباتی حقائق کو بسر وچشم قبول کرتا ہے۔

سیاسیات واخلاقیات:

ہر چند کہ سیاسیات واخلاقیات سے متعلق امام غزالی نے مفصل گفتگو نہیں کی ہے لیکن یہاں ہم عمیق منہاجیات کی غرض سے نکات کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ سیاسیات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''فلاسفہ کی سیاسی فکر عموماً اس الہامی پیغام سے مستعار شدہ ہے جو انبیاء کرام بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے لے کر آئے اور اس کے علاوہ اولیائے کرام کے افکار سے بھی خوشہ چینی کی ہے'' اخلاقیات کے علم کے متعلق بھی کم و بیش آپ کی یہی رائے ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر دو علوم میں آپ نے ایسے اضافے بھی کیے ہیں جن کا اطلاق علم سیاست پر بھی ہوتی ہے ان فلاسفہ نے اپنے فضول کام کو چمکانے کے لیے ان تعلیمات کو اپنی طویل و بے مقصد بحثوں میں خلط ملط کر کے رکھ دیا ہے۔

مابعدالطبیعات:

یونانی فکر کے محاکمہ وتنقید کا اصل مقصد درحقیقت یونانی مابعدالطبیعاتی عقائد کا بطلان ہی ہے جو امام غزالی مابعدالطبیعاتی قضایا کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اول قسم میں وہ مباحث شامل ہیں جن میں الفاظ کے معنی ومفہوم پر بحث کی جاتی ہے مثال کے طور پر لفظ 'جوہر' کو خدائے واحد کی ذات کے طور پر موسوم کیا جاتا ہے اور اگر وجود حقیقی کے معنی ومفہوم پر اتفاق ممکن ہو جائے تو لفظ جوہر کے مفہوم کو اس سیاق میں اشتقاقی نقطۂ نظر سے جانچنا ہوگا اور اگر اس نقطۂ نگاہ سے لفظ جوہر کے اس استعمال کا جواز مل بھی جائے تب بھی یہ سوال تشنہ ہی رہے گا کہ آیا مذہبی فکر اس استعمال کو سند بخشتی ہے یا نہیں اور یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ درپیش تنازعہ کی لفظی اور غیر لفظی حیثیت جاننے کے لیے نہ صرف یہ کہ الفاظ کے عمومی استعمال کو سمجھا جائے بلکہ ان الفاظ کے عمومی معانی پر بھی اتفاق پیدا کیا جائے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ افراد کے درمیان الفاظ کا یکساں استعمال ان کے معانی کے یکسانیت پر بھی دلالت کرتا ہو۔

تیسری قسم میں وہ فلسفیانہ نظریات شامل ہیں جو مذہب کے بنیادی اصولوں سے متخاصم ہیں مثلاً زبان کے اندر تخلیق کائنات کا مذہبی تصور خالق کائنات کے وجود کی صفات سے متعلق عقائد قیامت میں اجسام کا دوبارہ اٹھایا جانا۔ ان تمام عقائد کا فلاسفہ نے صریحاً انکار کیا ہے۔

دوسری قسم میں ایسی چیزیں شامل ہیں جن پر فلاسفہ یقین رکھتے ہیں اور وہ مذہب کے کسی بھی اصول سے متخاصم نہیں ہیں۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا فقط کلیات کا علم رکھتا ہے اور جزئیات سے اسے کچھ مطلب نہیں ہے امام نے اسے صریح کفر قرار دیا ہے۔ تہافتہ الفلاسفہ میں امام غزالی تیسری قسم میں شامل قضایا سے بھرپور بحث کی ہے اور ان قضایا پر مشتمل نظام فکری کی کجی وکمزوریوں کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

۶۔Modes of Critique تنقید کے مختلف تناظر:

امام غزالی نے مغربی فکر پر جو بھرپور تنقید کی ہے اس کو ہم مختلف سطحوں پر سمجھ سکتے ہیں۔

ا۔داخلی ۲۔خارجی ۳۔اقل حقوق ۴۔لازمی

داخلی تنقید کے باب میں تنقید کرنے والا اس مخصوص تناظر میں گفتگو کرتا ہے جس میں وہ رہتا بستا ہے اور اس کے مخاطب وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اور وہاں کی رائج شدہ اقدار برتتا ہے لیکن علمی وفکری برتری کے سبب وہ ترویج شدہ نظریات میں نہ صرف یہ کہ کسی بھی قسم کی خرابی کو جان لیتا ہے بلکہ یہ اس کے سدباب کی بھی کوشش کرتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غزالی تنقید داخلی تنقید نہیں ہے کیوں کہ یونانی فلسفہ کا محاکمہ پیش کرتے وقت آپ کی تمام تر وفاداریاں اسلامی فکر سے منسلک ہیں اور آپ اسلامی علمیت کی برتری کے بھی غیر متزلزل طور پر قائل ہیں آپ کی محاکماتی تحریروں کا اصل مقصد یونانی فلسفہ کی

بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور اس کی علمی برتری کے حوالے سے پھیلے ہوئے غلط العام تصورات کی بیخ کنی ہے تاہم آپ علمی تحقیق کے اس انداز سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ کسی بھی تنقید کو مؤثر بنانے کے لیے خود اس کے درون میں کمزوریاں تلاش کی جاتی ہیں اور جس فکر کو تنقید کا ہدف بنایا جائے اس سے مکمل واقفیت و آگہی حاصل کی جائے وگرنہ بھرپور و جامع تنقید ممکن نہیں ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''میری رائے یہ ہے کہ ایک شخص کسی بھی علم پر تنقید کا کوئی حق نہیں رکھتا جب تک وہ نہ صرف یہ کہ ان علوم کا اس قدر ماہر نہ ہو جائے کہ جس طرح خود اس علم کے ماہرین سے جس گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ان گوشوں پر بھی نگاہ ڈالنے کی اہلیت رکھتا ہو جو ان ماہرین کی نظر سے اوجھل رہے ہوں اس وقت اس کی تنقید کو اس علم کے حوالے سے اہمیت دی جائے گی۔''

امام کے نقطۂ نظر سے ''کسی نظامِ فکر کی مکمل تفہیم اور اس کی گہرائی و گیرائی کو سمجھے بغیر اس کو تردید کرنا عبث و بے فائدہ فعل ہے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو امام غزالی کی فکر اپنے بیشتر و متکلمین سے جدا نظر آتی ہے کیوں کہ متکلمین کا عمومی رویہ یہی رہا کہ وہ بنیادی فلسفیانہ فکر کو رد کرنے کے بجائے عالم اسلام میں موجود علمی بدعات پیدا کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے یونانی فلسفہ سے متعلق ان کا مبلغ علم اس قدر سطحی اور چند منتشر قسم کے قیاسات پر مشتمل تھا کہ اپنی تحریروں میں ان کا فلاسفہ سے کسی قسم کا مناظرہ موجود نہیں تھا۔ مبہم اور منتشر خیالات کے علاوہ ان کے دلائل اس قدر بکھرے ہوئے تھے کہ ایک عام فراست کا شخص ان سے دھوکہ نہیں کھا سکتا تھا۔ یہ متکلمین یونانی فلسفہ کو ہدف تنقید بنانے کے بجائے ان لوگوں کے نظریات سے بحث کر رہے تھے جو آہستہ آہستہ اہل اسلام میں درآئے تھے اور شریعتِ اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس ضمن میں وہ یونانی فلسفہ سے مستعار شدہ تصورات اور تکنیک سے بھی مدد لے رہے تھے۔ یونانی فکر سے بحیثیت مجموعی ناواقفیت کی بناء پر ان متکلمین کا انداز تنقید خارجی و آلاتی تھا۔

جب علم الکلام ایک باقاعدہ علم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو متکلمین نے شریعت کے دفاع کے لیے اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دیں اور جواہر وحوادث بشمول ان کی ماہیت و خصوصیات سے متعلق مقاصد میں مشغول ہو گئے لیکن وہ ان مسائل پر بھرپور و جامع طریقے سے غور وفکر نہ کر سکے جس کے نتیجے میں وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو انسانی فکر کو گمراہیوں سے مکمل طور پر نجات دلا سکتے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ متکلمین کا مخاطب وہ گروہ تھا جو اسلام کے بنیادی نظریات و عقائد پر ایمان رکھتے تھے لیکن کچھ اصولوں کی تشریحات میں وہ معروف سے اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور بیرونی فکر کے استدلال کو اصولیاتِ دین کو سمجھنے میں استعمال کو مستحسن سمجھتے تھے یہاں اگر دورِ حاضر کی کیفیت پر نگاہ دوڑائی جائے تو آج

بھی ایک گروہ اسی نوعیت کی کوشش وکاوش میں مصروف عمل ہے یعنی آج کی غالب سائنسی فکر کے پیش کردہ حقائق کو درست تسلیم کرتے ہوئے اسلامی عقائد کو ان کی مدد سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس ضمن میں یہ نکتہ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کے استدلال فقط ان لوگوں کو قائل کر سکتے ہیں جو پہلے ہی اسلامی فکر کی برتری کے قائل ہیں لیکن سائنسی علوم کے تربیت افراد کے لیے اس قسم کے استدلال نا قابلِ قبول ہوا کرتے ہیں کسی بھی نظام کی مکمل تنقید کے لیے جس طرح کی تفہیم کی ضرورت ہوتی ہے وہ علم الکلام میں شاذ ہی نظر آتی ہے علم الکلام کے مباحث زیادہ تر شریعت اسلامی کے دفاع سے متعلق ہیں کہ بیرونی فکر سے متاثر افراد کی نت نئی اختراعات کو استدلال کے ذریعے غلط اور غیر مربوط ثابت کیا جائے اور تضادات سے بھرپور ان کی فکر کے منفی اثرات ونتائج کو بھی واضح کیا جائے۔اس قسم کے طریقۂ کار مخالفین کے اس گروہ کے لیے تو کارآمد ہو سکتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ عقل وخرد کی برتری کے قائل ہیں ان کے لیے یہ بے فائدہ و لا حاصل ہے اس فکر کے حامل افراد کے درست طریقہ یہ پیدا کرتا ہے کہ مخالف کی فکر کے بنیادی اصولوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی مکمل گہرائی و گیرائی کے ساتھ تفہیم حاصل کی جائے اور اس نظام فکر کی بنیاد میں موجود التباسات وتسامحات کو واضح کیا جائے تا کہ خود اس کے بطن بطون سے اس کی تباہی جنم لے۔جس بات کا ادراک بہت کم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے سے تسلیم شدہ دلائل سے تسلیم کروانا بے کار محض ہے۔سائنس کے افراد کے لیے دوسرے قسم کے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔امام کلام کے اثرات کو رد نہیں کر رہے مگر ان کے خیال میں یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دوائیں مرض کی نوعیت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔

ان کی زیادہ تر منہاجیات ان اصولوں پر مبنی ہے کہ اپنے مخالفوں پر تضادات کو واضح کرنا اور جو منطقی نتائج وہ تسلیم کر چکے ہیں ان کے حوالے سے تنقید کرنا''۔[A1 p 28]

یہ طرز عمل ان مخالفین کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان مخالفین کے خلاف جو کچھ بھی تسلیم نہیں کرتے یہ طریقۂ تنقید لا حاصل ہے۔اس طرح مخالفین کے لیے ضروری ہے کہ مخالف کے طریقہ کار کو ممکنہ حد تک داخل کیا جائے۔اس حد تک کہ اپنا ضابطہ اخلاق متاثر نہ ہو اور اس نظام کی بے ربطگی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح وہ اندرونی طور پر ہی تباہ ہو جائیں گے۔

کسی بھی فکری نظام میں موجود ربط کو دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ منطقی ربط ۲۔ مجموعی نظام کا ربط

منطقی ربط کسی نظام کے (صوری) اندرونی ربط سے متعلق ہوتا ہے۔اس نوع کی تنقید (جس کا مقصد کسی نظام میں موجود صوری ربط کی صحت کو جانچتے ہیں) کو اقل کل تنقید کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے جس کو ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے جب کہ انتظامی ربط سے مراد کسی نظام کے اندرونی ربط کو مکمل طور پر ساختی اور وجودی طور پر سمجھنا ہے لہٰذا جب امام غزالی فلاسفہ مغرب کے افکار کی اندرونی بے ربطگیوں کی جانب اشارہ

کرتے ہیں تو اس کا مقصد فقط فلسفیانہ عقائد ونظریات میں موجود کمزوریوں کی نشاندہی نہیں بلکہ وہ اس مخصوص علمیت کے تضادات کو بھی بڑی صراحت کے ساتھ واضح کرتے چلے جاتے ہیں جس میں عقل محض کو خود مکتفی اور واحد راہنما کے طور پر تصور کیا جاتا ہے باایں وجہ امام غزالی کے ردواعتراضات کو جز کی شکل میں نہیں بلکہ کل کے طور پر سمجھنا چاہیے اور اسی بنیاد پر امام غزالی کی تنقیدی فکر ایک خاص مقام کی حامل ہے کہ یہ کسی نظام کے خارجی وداخلی ہر دو پہلوؤں سے مکمل طور پر بحث کرتی ہے اس کی وضاحت یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح متکلّمین نے غیر اسلامی فکر پر تنقید مرتّب کرتے ہوئے ہمیشہ اسلامی علمیت کی برتری کو جزوِایمان سمجھا اور اسکو محور ومرکز بناتے ہوئے باطل فکر کو ہدفِ تنقید بنایا اس اندازِ فکر کو بیرونی تنقید کا عنوان دیا جاسکتا ہے جب کہ دوسری جانب خارجی تنقید کے ضمن میں اس نظریہ کی مکمل طور پر تفہیم حاصل کی جاسکتی ہے جس پر تنقید کا مقصد ہوتا کہ اس استدلال کی غلطی وکجی کو خود اس کے دروں سے واضح کی جائے۔

ہر چند کہ امام غزالیؒ کی یونانی تنقیدی فکر مکمل طور پر مربوط حیثیت کی حامل ہے لیکن اس کو کئی حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ہر چند کہ امام غزالیؒ کی یونانی فکر پر تنقید کئی سطحوں پر مبنی ہے لیکن اس سے اس کی مربوط حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس فکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ اوّل یہ ثابت کرنا کہ فلاسفہ جن تصوّرات کو بدیہی وغیر مشکوک تصوّر کرتے ہیں وہ بدیہی نہیں ہیں۔ دوسرے مرحلے میں امام غزالیؒ کچھ اپنے متبادل نظریات پیش کرتے ہیں جنہیں فلاسفہ کے تصوّرات کی مانند بدیہی قرار دیا جاسکتا ہے اور اسطرح اس بنیادی دعویٰ کی حیثیت کو کمزور کر دیتے ہیں کہ ان کی فکر کی بنیاد عقل کی مدد سے حاصل کردہ بدیہی قضایا پر ہے۔ امام غزالیؒ فلاسفہ کے تخلیق کائنات کے نظریہ کو غیر منطقی اور لایعنی تصور کرنے سے یوں بحث کرتے ہیں۔

آپ حضرات کو یہ کیوں کر علم ہوا کہ کسی بھی وقوعہ کی ابتداء ارادہ الٰہی کو قرار دینا غیر منطقی ومحال ہے؟ آیا اس کے پس پشت کوئی ناقابل تردید بدیہی عقلی دلیل ہے یا کوئی اور نظریاتی بنیاد ہے اور کیا آپ کے اس بیان میں کوئی حد اوسط موجود ہے یا نہیں؟ اگر معاملہ یہ ہے کہ اس بیان میں حد اوسط موجود ہے اور آپ استخراجی طریقہ کار کے عامل ہیں تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ حد کیا ہے اور اگر آپ اسے بدیہی قرار دیتے ہیں تو آپ کے مخالف اس کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ جب کہ وہ لوگ جو کائنات کو حادثہ تصور کرتے ہیں ایک خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں لہٰذا فلاسفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ منطق کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کائنات کی ابتداء کو ارادہ الٰہی کے تابع ہونے کو محال قرار دیں۔

درج بالا استدلال کی مدد سے نہ صرف فلاسفہ کے عقائد ونظریات کے غیر حقیقی پن کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے استدلال میں ربط کی کمی کا بھی پتا چلتا ہے کہ یہ فلاسفہ ریاضی اور منطق کے اظہاریوں سے متعلق یکساں رائے کا اظہار کرتے ہیں لیکن مذہبی اور مابعد الطبیعاتی عقائد کا معاملہ آتا ہے تو نزاع کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر صداقت تک رسائی کے لیے عقل ہی واحد راہنما و راہبر ہوتی تو اس کے مقلدین کے درمیان یہ تفرقات جنم نہ لیتے۔امام فرماتے ہیں

'ان فلاسفہ کے ہاں کوئی شے مستقل و غیر متغیر نہیں ہے۔ان کے تمام بیانات اندازوں اور قیاسات پر مبنی ہوا کرتے ہیں اور انکا واسطہ نہ تو مذہبی عقائد سے ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو تجربی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔وہ ریاضیاتی اور منطقی علوم کی مدد سے مابعد الطبیعاتی نظریات اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ریاضیاتی علوم کی مانند ان کے مابعد الطبیعاتی عقائد و نظریات بھی قطعی و مستند ہوتے تو ان کے درمیان اختلافات کی کوئی صورت نہ ابھرتی۔

سطور بالا میں واضح طور پر امام غزالی اس نکتہ کو بیان فرماتے ہیں کہ اگر یہ مابعد الطبیعاتی عقائد غیر مشکوک ،واضح اور قطعی ہوتے تو ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اس سے پتا چلتا ہے کہ فلاسفہ اپنے استدلال کو مستحکم کرنے کے لیے ان خود ساختہ عقلی اصولوں پر انحصار نہیں کر سکتے اور اس سے ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ ان مسائل کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ جنہیں کسی نوع کے واقعاتی یا تاریخی شواہد کی مدد سے حل کیا جا سکے۔اسی طرح یہ دلیل یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ اختلاف منطقی،تضاد سے نہیں ابھرتا اور نہ یہ ابھر سکتا ہے اور کے ثبوت کی ذمہ داری فلاسفہ پر ہے جو مابعد الطبیعیاتی عقائد کو واضح اور عقلی اصولوں کے مطابق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہمارا تعلق منطق اور حقیقی عمل سے ہے اور ان فلاسفہ کے برخلاف غیر منطقی عقلی شواہد اور بدیہی تصورات کے وجود کو صحیح تصور نہیں کرتے۔

امام غزالی کے پس پشت کارفرما مقصد یہ ہے کہ عقل کے خود مکتفی و راہنمائے واحد کے نظریہ کے بودے پن کو ثابت کیا جائے اور یہی آپ کی فکر کا نہایت اہم نکتہ ہے۔مابعد الطبیعاتی عقائد سے متعلق بیانات اپنی نوعیت میں ترکیبی ہوتے ہیں جن کے لیے حد اوسط کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ حد اوسط اپنے موضوع موجود معلومات سے بڑھ کر فراہم کرتا ہے۔اس کے علاوہ استخراجی طریقہ کار کے درست ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بنیادی قضایا بدیہی و غیر مشکوک ہوں جب کہ امام یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مابعد الطبیعاتی عقائد کا اظہار کرنے کے والے بیانات کے لیے یہ شرط ضروری نہیں۔اگر بنیادی قضایا بدیہی و غیر مشکوک نہیں ہیں تو اس سے کوئی لازمی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔دوم نتیجہ کی لزومی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے حد اوسط کا ہونا ضروری ہے جب کہ مابعد الطبیعاتی بیانات کی نوعیت تحلیلی کے بجائے ترکیبی ہوتی ہے لہٰذا ان بیانات میں حد اوسط کا ہونا ممکن نہیں۔اب اگر تحلیل و تجزیہ کی مدد سے حد اوسط کو نہیں سمجھا جا سکتا تو کچھ ایسے ذرائع ضرور ہونے چاہییں جنکی مدد سے حد اوسط تک رسائی ممکن ہو اس ضمن میں یونانی فلاسفہ کا خیال تھا کہ عقل میں بذات خود وجدانی و انکشافی صلاحیت موجود ہے جس کی مدد سے وہ علم میں خاطر خواہ اضافہ کو ممکن بناتی ہے اور اسی صلاحیت کی بدولت بدیہی و قطعی قضایا بھی وضع کیے جاتے ہیں۔مغربی فلاسفہ کے غیر منطقی عقلی لزومیت اور عقل کے خود مکتفی ہونے کے نظریہ پر یقین کی بنیاد یہی ہے جس کو امام غزالیؒ نے بالخصوص ہدف تنقید بناتے ہیں۔

عقلی لزومیت کے اس نظریہ کے بودے پن کو ثابت کرنے کے لیے امام ایک اور طریق استدلال کا سہارا لیتے ہیں جسے دلائل تضمین کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔اس طریق استدلال میں امام ایک دوسرے استدلال جسے فلاسفہ یونان بدیہی تصور کرتے ہیں، کو غلط اور لغو ثابت کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر ابتدائی استدلال کو بھی مہمل قرار دیتے ہیں اور یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ عقلی لزومیت کا نظریہ اس قدر بدیہی وقطعی نہیں ہے کیوں کہ اگر کسی ایک استدلال کو مشکوک ثابت کر دیا جائے تو منطقی عقلی لزومیت اور خود وجودیت کا مکمل نظریہ مشتبہ وغیر بدیہی قرار پاتا ہے لہٰذا جب وہ کائنات کی ابدیت کے نظریے سے بحث کرتے اور اس میں شامل عقلی لزومیت اور خود مکتفی کو اس کے اجزاء کے طور پر لیتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی وہ افلاطون کے پیش کردہ روح کی ابدیت کے نظریہ کو بھی شامل بحث کر لیتے ہیں جسے وہ اسی انداز میں بدیہی وقطعی سمجھتا ہے۔امام غزالی افلاطون کے عقیدے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

'افلاطون کا خیال تھا کہ روح ابدی ہے اور جب اجسام میں جاتی ہے تو یہ تقسیم ہو جاتی ہے اور اجسام سے نکل کر واپس اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔'امام اس عقیدے کو دلائل تضمین کی مدد سے تجزیہ کرتے اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ بدیہی نہیں ہے۔

'اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عقیدہ اس درجہ قابل مذمت ہے کہ اسے فوری رد کرنا چاہیے۔سوال یہ ہے کہ کیا زید کی روح عمر کی روح کے مماثل ہے؟ اگر اسے مماثل قرار دیا جائے تو یہ نہایت لغو بات ہوگی۔زید وعمر دونوں اپنے وجود سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دونوں آپس میں یکساں خصوصیات کے حامل نہیں۔اگر ارواح اپنی نوعیت میں مماثل ہوتیں تو وہ یقیناً وقوفی حیثیت میں بھی یکساں تصور کی جاتیں جو ارواح کی لازمی وضروری صفات ہیں۔لیکن اگر یہ کہا جائے کہ زید کی روح عمر کی روح سے اپنی نوعیت میں مختلف ہے اور دونوں ارواح کے دو مختلف اجسام میں منقسم ہونے کے نتیجہ میں ایک دوہریت وجود میں آتی ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جوہر کی تقسیم، جسے روح کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کو کسی ماہیت یا مقدار کی اکائیوں میں نہیں سمجھا جا سکتا قطعی ناممکن ومحال ہے۔پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ روح جو اکائی کی شکل میں ہے اسے ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر دوبارہ اسی سابقہ اکائی میں واپس آجائیں۔اس نوعیت کا عمل فقط ان اشیاء کے ساتھ ممکن ہوتا ہے جو کسی مقدار اور ماہیت کی حامل ہوں۔مثال کے طور پر سمندر کے پانی کو دریاؤں وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ان کا دوبارہ سمندر کی صورت بن جانا بھی ممکن ہے لیکن ایک غیر مقداری بے ماہیتی شے کو کس طرح منقسم کیا جا سکتا ہے؟'

ایک ایسا استدلال جس کی علمی حیثیت کو عقلی طور پر قطعی وغیر مشکوک سمجھا جاتا تھا اس کی کمزوری کو مکمل طور پر واضح کر دیا۔اس کے بعد آپ اس استدلال کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو اصل موضوع بحث ہے۔اس تمام استدلال کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ کائنات کی بذریعہ ارادہ الٰہی کی تخلیق کے نظریے کو اپنے مخالفین کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے جب کہ وہ ایسی کوئی چیز دلیل کے برعکس ثابت نہ کر دیں مگر جب یہی دعویٰ ان کے فلاسفہ نے اپنے عقیدے کو

جھٹلاتے ہوئے کی تو ان کے لیے اس تنقید پر خاموشی اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اور یہ ایک ناقابلِ فرار حالت تھی۔

امام غزالی نے اسی طریقہ استدلال کے ساتھ کام لیتے ہوئے فلاسفہ کے انکار تخلیق کائنات بذریعہ وحی الٰہی کے نظریہ سے بحث کی ہے۔ 'فلاسفہ کا بیان ہے کہ اگر کائنات کی تخلیق ارادہ الٰہی کے ماتحت ہوتی ہے تو یہ اب کیوں ہوا اور اس سے پہلے کیوں نہ ہوا؟'

آپ جواباً یوں بحث کرتے ہیں 'ایسا کیوں کر ہوا کہ شمال وجنوب میں دو نقاط کو قطبین تصور کر لیا گیا؟ کیا وجہ ہے کہ دائرۃ البروج کا گزر کسی اور دو نقاط سے نہیں ہوا اس طرح تو دائرۃ البروج کے مخالف نقاط کو بھی قطبین قرار دیا جانا چاہیے تھا؟ بہشت کی ماہیت وجسامت میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو سکتی ہے لیکن ایک قطب کو کسی بھی دوسرے مقام سے کیوں کر ممیّز کیا جا سکتا ہے؟ یا وہ کیا وجہ تھی جس کی بنا پر کسی مخصوص نقطہ کو دیگر تمام نقاط کے مقابلے میں ایک قطب کے طور پر منتخب کر لیا گیا؟ کیا تمام نقاط مشابہ نہیں ہیں جیسا کہ ایک دائرہ کے تمام اجزاء مساوی ہوتے ہیں؟ فلاسفہ اس مسئلہ کو کسی صورت بھی حل نہیں کر سکتے' اس تمام گفتگو سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ فلاسفہ کا عقلی لزوم اور خود وجودیت پر ایمان اور اس کی بنیاد پر تمام عقائد کی پرکھ فکر کی گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے اور خود یہ فلاسفہ اس درجہ اہلیت کے لائق نہیں کہ وہ فطرت اور مظاہر فطرت کی اپنی واقعاتی تشریح کے دفاع میں مضبوط و مستحکم استدلال پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس داخلی سقم کی بھی آگہی ملتی ہے کہ دوسروں عقائد ونظریات پرکھنے کے لیے جن براہین سے کام لیا جاتا ہے خود اپنے افکار کے سلسلے میں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

امام غزالی نے اپنی تنقیدی فکر میں جس استدلال سے کام لیا ہے اسے متکلمین از منہ وسطی کے دانشوروں اور مناظرہ کے فن میں اساتذہ کا درجہ رکھنے والوں کے ہاں 'الجواب الالزامی' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن یونانی مابعد الطبیعات کے ضمن میں اس طریق استدلال کو امام غزالی کی بدولت ایک نیا عروج حاصل ہوا۔ اس اندازِ تنقید میں ایک جانب تو یہ کہ داخلی تنقید مرتّب کی جاتی ہے اور مخالف عقیدے کی صحت کو پرکھا جاتا دوسری جانب اپنے عقائد ونظریات کو مخالف کے اصولوں کی نذر نہیں کرتے اور ان پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اس سے ایک منفی سا تاثر ابھرتا ہے کہ یہ انداز فکر مخالف کو تو سوالات سے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے جب کہ خود پر کسی نوع کا اعتراض وارد نہیں ہونے دیتا اور اس کی علّت یہ ہے کہ ابتدائی طور پر مد مقابل کو خود اپنے وضع کردہ معیارات کے مطابق اپنے دعوؤں کو ثابت کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اس میں کسی خارجی معیار کو شامل نہیں کیا جاتا لیکن خود اپنے نظریات کو ان کے معیارات کے مطابق جانچنے کی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ اس سے ماقبل وہ ان معیارات پر دلائل کی مدد سے اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں مہمل و بے معنی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس طرح یہ ممکن نہیں رہتا کہ اُن معیارات کی بنیاد پر اِن کے عقائد ونظریات کو پرکھا جائے۔

اس مقصد کے لیے مختلف سطحوں پر مختلف دلائل کی ضرورت پڑتی ہے جس کا تفصیلی بیان اوپر آ چکا ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

ا۔ اس بنیادی دعویٰ کو رد کرنا کہ مابعد الطبیعاتی عقائد اور دیگر تنازعوں کی بنیاد کسی قسم قطعیت پر ہے اور جواب میں ایسی مثالیں پیش کرنا جس کی مدد سے ان کے متبادل دعووں کو بھی مذکورہ دعووں کی طرح قطعیت کا حامل قرار دیا جائے۔

۲۔ مخالف کے عقائد و نظریات میں موجود تاریخی و واقعاتی اغلاط کو واضح کرنا۔

۳۔ مخالف کے عقائد و نظریات میں موجود منطقی تضادات واضح کرنا۔

۴۔ ان نکات کی مدد سے عقل کے مکتفی کے نظریہ کے ابہام کو واضح کرنا۔ اس ضمن میں اوپر بحث کیے گئے دلائل تضمین کو بھی شامل استدلال کی گیا ہے۔

خارجی تنقید:

خارجی تنقید سے مراد خود آپ اپنے وجود سے جدا دیگر افکار کو پرکھنا و جانچنا ہے۔ بیرونی فکر کی صحت کو اس طرح بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ اس کے اندرونی ربط کو دیکھا جائے کہ وہ اپنے ذروں میں کس قدر مربوط و منضبط ہیں اس کے علاوہ خود ان کے وضع کردہ معیارات کی بنیاد پر بھی ان کے افکار کی صحت کی آزمائش کی جا سکتی ہے جیسا کہ عقل کی فضیلتوں کی تنقید کے بیان میں امام غزالی کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

داخلی و خارجی ہر دو تنقیدات کا یہ امتزاج اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ عقل کی مؤثر فضیلتوں کو درست طور پر سمجھا جائے اور اس اشتراک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیگر عقائد و نظریات کمزور وغیر مستحکم ثابت کر دیا جائے اور اس سطح پر ہمیں ہر قسم کے تیر و تفنگ سے کام لینا پڑے گا لہٰذا اس امر کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی کہ حالت جنگ کی نوعیت کو درست طور پر سمجھتے ہوئے ہر طرح کی تنقید کو ایک کل میں سمو کر مخالف کی پوزیشن کو کمزور کیا جائے۔ درحقیقت ہم آج ایک خاص طرح کی حالت جنگ میں ہی ہیں جو عقائد و نظریات کی برتری کی جدوجہد ہے جس میں ہر سو فریقین مصروف عمل ہیں اور اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا ماحول یا فضا تخلیق کی جائے جو ہمارے حق میں ممد و معاون ثابت ہو اور مخالف افکار کے لیے ضروری غیر معاونت کا سبب بنے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس فضا کے سازگار ہونے میں ماہ و سال نہیں صدیاں لگ سکتی ہیں۔ یہ ایک طویل المیعاد علمی و تہذیبی جنگ ہے اور کسی بھی جنگ کی مانند اس میں بھی کبھی اقدامی حالت ہوگی تو کبھی پسپائی کی حکمت عملی اختیار کرنا پڑے گی، کبھی شب خون مارنا پڑے گا تو کبھی دُبک کر بیٹھ جانے میں عافیت ہوگی۔ غرض ہر طرح کی تدبیر سے کام لینا ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں:

> 'یہ خوب جان لو کہ ہماری جدوجہد کا مقصد ان لوگوں کے خلاف کاروائی کرنا ہے جو فلاسفہ یونان پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں اور اُن کی فکر کو کسی بھی نوع کے اشتباہ سے مبرّا و منزّہ سمجھتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ یونانی فکر میں موجود تضادات و اغلاط کو مکمل طور پر عیاں کیا جائے اور اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی فکر کے

بجائے ان عقائد ونظریات پر حملہ آور ہوا جائے'

یہاں اس نکتہ کو مکمل اہمیت کے ساتھ محسوس کیا جانا چاہیے کہ داخلی واندرونی تنقید کے دوران امام غزالی نے اپنے اعتقادات کی حیثیت کو ہمیشہ برتر محسوس کیا اور آپ کی فکر کے مکمل مطالعہ میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ وہ کسی قسم کی مصالحت آمیز فکر کے قائل نہیں لیکن آپ اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک مضبوط و مستحکم تنقید مرتب کرنے کے لیے یونانی فلسفہ کے بنیادی اصولوں کے حوالے سے مکمل املاک حاصل کیا جائے خود اس فکر کے اندر سے تنقید کے لیے کمزور گوشے تلاش کیے جائیں ۔مزید برآں یہ کہ آپ کسی بھی نوع کی معروضیت یا تجریدیت کے بھی قائل نہیں ہیں ۔آپ کی تمام تر گفتگو اسلامی علیت وصداقت کی برتری کے حوالے سے مستشرح ہے جب کہ یونانی علوم وفلسفہ آپ کفریہ عقائد کا مجموعہ تصور کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بنیاد تصور کیے بغیر مغربی تہذیب کا کسی قسم کا اسلامی محاکمہ سرے سے ممکن ہی نہیں ۔اصولی طور پر یوں کہہ لیجیے کہ اندرونی تنقید کو خارجی تنقید کے تناظر میں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

امام غزالی واضح طور پر یہاں فرماتے ہیں کہ عقلی بنیادوں پر صداقت کا حصول ممکن نہیں ہے بلکہ فقط وحی الٰہی اور رحمت خداوندی وہ کنجی ہیں جن کی بدولت انسان راہ حق پا سکتا ہے۔کسی فرد کا کفریہ عقائد سے تائب ہو کر اسلام قبول کر لینا خداوند تعالیٰ کی عطا سے ہی ممکن ہے اس میں کسی منطقی استدلال اور عقلی موشگافیوں کو کچھ دخل نہیں ہے۔اندرونی تنقید کے باب میں یہ باور رکھنا چاہیے کہ آپ عقل کی خود مکتفی حیثیت کے قائل نہیں ہیں اس کے برعکس خارجی تنقید کو خاص اہمیت دیتے ہیں کہ جس کے تحت اندرونی تنقید اپنا تأثر قائم کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ داخلی تنقید کی نوعیت منفی ہوا کرتی ہے جب کہ اس کے اثبات کو خارجی و بیرونی تنقید کے باب میں سمجھا جا سکتا ہے۔امام مثبت کے طور پر اس فیصلہ کن دلیل کو رد کرتے ہیں۔

مطلق سچائی تک پہنچنے کے لیے کوئی عقلی میدان موجود نہیں ہے، مطلق سچائی کا انحصار مکمل طور پر رحمت خداوندی اور رہنمائی پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کام کا بے جا طور پر کارتیسی نظریات سے موازنہ کیا گیا ہے۔امام واضح طور پر کہتے ہیں کہ کسی شخص یا گروہ میں تبدیلی (یونانی عقیدہ سے اسلام میں) کا انحصار رحمت خداوندی پر ہے نہ کہ محض دلیل کی خود انحصاریت پر۔امام غزالی کی داخلی تنقید دلیل کی خود انحصاریت پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ مستقل طور پر خارجی تنقید کے ضمن میں دیے گئے مواد کی تصدیق کرتی ہے۔لہٰذا اندرونی تنقید خارجی تنقید کی دلالت کی حد تک منفی ہے۔

اب امام غزالی کی سطور کا جائزہ لیجیے

'یہ امر طے شدہ ہے کہ مطلق صداقت تک رسائی کسی دلیل یا عقل کی بدولت نہیں بلکہ خدا کی اس رحمت کی بدولت ہوا کرتی ہے جسے وہ راہ راست پر رکھنا چاہتا ہے اس کے دل میں اپنا نور داخل کر دیتا ہے اور یہ نور خداوندی علم حقیقی کا ایک جزو لازم ہے جب

نبی آخرالزماں حضرت محمدﷺ سے کسی نے جب شرح کے معنی دریافت کیے اور اس آیت کے حوالے سے مطلب پوچھا کہ 'جب خدا کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے تو اس کے سینے کو اسلام یعنی خدا کی محبت کے لیے کھول دیتا ہے' تو آپﷺ نے فرمایا کہ 'یہ وہ نور عظیم ہے جسے خدا دل میں داخل کر دیتا ہے' پوچھا گیا 'اس کی نشانی کیا ہے؟' فرمایا 'ایسا شخص گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر فکر آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے' اس نور خداوندی کے متعلق آپ کا ارشاد ہے 'خدا نے مخلوق کو تاریکی میں تخلیق کیا اور پھر ان میں اپنا نور پھونکا' اسی نور خداوندی کی بدولت ہی اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور یہ نور متعین عرصہ میں رحمت خداوندی کی جانب پھوٹتا ہے اس کے قرب و دیدار کے لیے یقیناً کوشش کرنا چاہیے۔ حضرت محمدﷺ کا فرمان عالیشان ہے کہ 'آج اس دور میں رب کائنات کی رحمتوں کا دریا عروج پر ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ خود کو سیراب کرنے کی کوشش کرو'

کوئی اندرونی تنقید اسلامی عقائد و شعائر کو تسلیم کیے بغیر حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی اور تمام دیگر نظریات کو اسلامی علمیت کی بنیاد پر ہی جانچا و پرکھا جائے اور یہ فقط خارجی تنقید کے ضمن میں ہی ممکن ہوتا ہے کہ دیگر عقائد کی مکمل تفہیم اور ان پر تنقید اسلامی فکر کو معیار سمجھتے ہوئے کی جائے۔

یہاں تہافہ کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے جو خاص اسلامی علمیت کے ساتھ ہی مخصوص ہے کہ اپنے عقائد کو ترک کیے بغیر خارجی تنقید مختلف نظام ہائے فکر پر ان کے بطنِ بطون سے تنقید مرتب کی جائے اس طرح داخلی و خارجی ہر دو انداز تنقید کا منفرد امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔

اسلام ایک آفاقی پیغام کا حامل مذہب ہے جس کی ترویج و اشاعت کے لیے ابتدائے کائنات ہر قوم و نسل میں انبیاء کرام کا ظہور ہوا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کا گروہ جس قدر بھی صراط مستقیم سے کیوں نہ ہٹ جا ئے ان کے قلوب میں حق کی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور موجود ہوگی۔ جسے کوشش و کاوش سے مزید روشن کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کا ہر علم اپنے دور میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ رکھے ہوئے ہے جو دراصل کسی نا کسی طور پر انبیاء کی تعلیم کا استخراج ہے جنھوں نے خدا اور آخرت پر یقین کو ہمیشہ مرکزی حیثیت دی اور دور حاضر کے علوم (چاہے قدیم ہوں یا جدید) کسی حد تک ان عقائد سے متعلق نظر آتے ہیں۔

ایسے افراد جو ان بنیادی اصولوں سے منکر ہیں انھیں مکمل طور پر گمراہ سمجھنا چاہیے اور ان کے علمی مقام کو اہمیت دینے کی بھی چنداں فرصت نہیں اور نہ ہی ان کی گفتگو پر دھیان دیا جائے۔ یہ لوگ درحقیقت شیطان کے بہکاووں میں آ کر گمراہی و جہالت کی اتاہ گہرائیوں میں گر چکے ہیں۔ ایک باشعور و فہیم شخص یقیناً غلط العام تصورات سے فوری چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جنہیں گمراہی و ضلالت کا شکار ان قوموں کو حکمت و دانش کا

شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

اس سیاق میں امام غزالی کی فکر ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یونانی فلسفہ میں موجود ان عناصر کو سمجھا جائے جو صداقت کے حصول اور کذب سے برأت کے اظہار میں معاونت کا سبب بنتے ہیں اس مقصد کے تحت آپ ہر دو ادوار کے یونانی فلسفہ کے نظریات کے درمیان امتیاز کرتے ہیں تو دوسری جانب یونانی فکر و فلسفہ کے مختلف مکاتب کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔اول جز کے بارے میں آپ فرماتے ہیں:

> 'یہ کتاب (تہافہ) اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ قدیم فلاسفہ کے وہ مقلدین جنہیں دہریے تصور کیا جاتا ہے وہ دراصل اس الزام کے مستحق نہیں ہیں۔انہوں نے مذہبی قوانین کا کبھی انکار نہیں کیا۔اس کے برعکس وہ نہ صرف وجود باری تعالیٰ کے قائل ہیں بلکہ انبیاء کرام پر بھی یقین رکھتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ معاملات میں وہ التباس کا شکار ہو کر صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور دوسروں کے لیے بھی گمراہی کا سبب بنے۔ہم اس تصنیف میں ان کی فلسفی کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جن کی بناء پر وہ باطل کا آلۂ کار بن گئے۔'

آپ یونانی فلسفہ کہ ان کی فکر کے اعتبار سے تین مکاتب میں تقسیم کرتے ہیں

۱۔ ماڈیت پسند ۲۔ فطریت پسند ۳۔ مذہب پسند

ان مکاتب فکر سے متعلق امام کی رائے کو مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ آپ مادیت پسند کو فلاسفہ کا وہ گروہ تصور کرتے ہیں جو کائنات کی ابدیت کے قائل ہیں اور یہ ازل سے موجود ہے۔یہ گروہ خالق کائنات کا بھی منکر ہے۔امام غزالی اس فکر کے جاہل افراد کو کافر و زندیق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے گروہ میں وہ حکماء شامل ہیں جو عالم فطرت سے متعلق تحقیقات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور حیوانات کے اعضاء جسمانی کی جراحت کے علم کے بارے میں ان کی کاوشیں قابل ذکر ہیں لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تخلیق کے عمل کی گہری تفہیم اور عجائبات عالم پر اس قدر شدید غور و فکر کے بعد بھی انھیں یہ احساس نہ ہوا کہ اس عالم آب و گل کے پس پشت اک عظیم ہستی کارفرما ہے جو علیم و خبیر ہے اور جس نے اس تمام کائنات کو خلق کیا ہے۔اس کے بجائے وہ خود فطرت کو خود مکتفی اور مانند از خدا سمجھنے لگے۔وہ ذات باری تعالیٰ کے انکاری نہیں تھے بلکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ خدا کائنات کی تخلیق کے بعد کائنات سے ایک معنوں میں لاتعلق ہو گیا ہے اور اب وہ قوانین فطرت یا انسانی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا۔ان کا یہ تصورِ خدا بعد کے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فطرتیت پسندوں کے گھڑی ساز خدا کے نظریہ کے مماثل نظر آتا ہے۔آپ ان کے عقائد کے بارے میں فرماتے ہیں:

'یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ موت روح کو آتی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کی طرف نہیں لوٹتی اس کے علاوہ دوزخ، بہشت کی ابدی زندگی، اجسام کے دوبارہ اٹھائے جانے اور پھر ان کے بھی مماثل نہیں یعنی آخرت فرمانبرداروں کے لیے جزا اور گناہ گار وں کے لیے عذاب کا عقیدہ ان کے لیے درست نہیں ہے۔'

امام غزالی ان لوگوں کا شمار بھی کافروں میں کرتے ہیں کہ یہ خدا اور اس کی صفات کے تو قائل ہیں لیکن روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

۳۔ تیسرے گروہ میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام قابل ذکر ہیں۔ امام کی رائے میں خدا پرستوں کے اس گروہ نے مادیت پسندوں اور فطرت پرستوں کے نظریات پر اس درجہ کڑی تنقید کی کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی اور قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

'خدا نے ان کی آپس کی لڑائی میں ایمان رکھنے والوں کو بخش دیا' تہافتہ الفلاسفہ میں اسی قسم کے کلمات معتزلہ اور دیگر گروہوں کے بارے میں بھی موجود ہیں۔

''ان فرقوں کے بارے میں میرا نظریہ کچھ اس نوعیت کا رہا ہے کہ ہم تمام تر اختلافات کے باوجود فلاسفہ کے مقابلے میں باہم متفق و متحد ہیں جب کہ اختلاف عموماً فقط معاملات کی تشریح کے حوالے سے ہی ہے لیکن فلاسفہ کے مذہبی عقائد پر اعتراضات کے جواب میں ہم اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف ایک ہیں اور ہمیں اس مقصد کی خاطر اپنے ذاتی تنازعات کو لازمی طور پر پس پشت ڈالنا ہوگا۔''[tp.8]

یہ سطور اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ہمیں امام غزالی کے طریقۂ کار کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ امام اسلام کے دشمنوں کے خلاف جن قوتوں سے اشتراک واتحاد کو ممکن قرار دیتے ہیں ان کے عقائد میں خدا اور روز آخرت پر ایمان ضرور شامل ہونا چاہیے اور یہی وہ معیار ہے کہ جو اہل اسلام کے ساتھ اشتراک عمل کی بنیاد بنتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ حق وصداقت کا تنہا وواحد معیار اسلام ہے اور دیگر قوتوں کے ساتھ کسی نوعیت کا عارضی اتحاد فقط مقصد کے حصول تک محدود رہنا چاہیے اور مستقل نوعیت کے اشتراک سے گریزاں ہی رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مادیت پسندوں اور فطرت پسندوں کے مقابلے میں ان الٰہ پرستوں کو ترجیح دینے کے باوجود آپ انہیں کافر قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور اس کے علاوہ افلاطون وارسطو کے مسلم مقلّدین مثال کے طور پر ابنِ سینا، فارابی وغیرہ کو بھی ان کے افکار کی بدولت مسلمان تصور نہیں کرتے۔

اگر چہ امام تینوں گروہوں کے افکار کو مسترد کر دیتے ہیں لیکن الہٰ پرستوں کے معاملے میں آپ عارضی نوعیت کی مصالحت کو ممکن سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ گروہ بھی خدا اور روزِ آخرت پر یقین رکھتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر کسی طرح کا اشتراک عمل ممکن نہیں۔

اس سے قطع نظر کہ یونانی الہٰ پرستوں کے حوالے سے امام کا تجزیہ تاریخی طور پر درست ہو یا نہ ہو اہمیت ان اصولوں کی ہے جن کی بنیاد پر وہ مختلف عقائد ونظریات کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ان کے نام نہاد الہٰ پرستوں کے خلاف امام غزالی کی فکر کو watt مختصراً یوں بیان کرتے ہیں،''الغزالی کی اصل کامیابی افلاطونی دلیل پر طرز فکر کی تعمیر اور پھر اس کا استعمال کرنا تھا اور پھر اسلامی الہٰیات کی از سرِ نو تعمیر تا کہ نئی افلاطونی تعلیمات کو اسلام سے ہم آہنگ کر سکے اور ان کے تمام دوسرے فلاسفہ کی کمزوریوں کو واضح کر سکے۔یونانی فلسفیانہ طریق استدلال کا اسلامی عقائد کے ساتھ اشتراک 'العشری' تک تقریباً مکمل ہو چکا تھا اگر چہ اس پر مزید کام غزالی کے بعد کے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی نے ان نو افلاطونی فکر سے بہت کچھ سیکھا مگر یہ الزامات کہ انھو ں نے بعض ان بنیادی فلسفوں سے استفادہ کیا ہے جس کی انھوں نے ابتداء میں تردید کی تھی،قابلِ تردید ہیں۔یہ الزامات ان افکار کی بنیاد پر لگائے گئے ہیں جو غلط طور پر غزالی سے منسلک کیے جاتے ہیں۔

درج بالا سطور سے ایک بنیادی اصول یہ سامنے آتا ہے کہ جس طرح دور میں ہر جگہ خدا کے نیک بندے پائے جاتے ہیں اور دنیا کبھی ان سے خالی نہیں رہی یہ کائنات کے قائم ودائم رہنے کی علت ہے اور انہی کی وجہ سے دنیا پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صداقت کو کہیں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بدعقیدوں اور فلاسفہ کے افکار سے سچ اور جھوٹ کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔تنقید نگار کا کام اس جوہری کی طرح سے ہے جو اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے کھرا اور کھوٹا علیحدہ کر لیتا ہے۔

لازمی تنقید کے باب میں استدلال کا طریقہ کار کچھ یوں ہوتا ہے کہ اس میں شہادت سے مدد لی جاتی ہے اب چاہے وہ شہادت تاریخی ہو یا واقعاتی ہم اس انداز تنقید کو کسی فکر کے واقعاتی سقم کو جانچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اگر وہ واقعاتی سقم اس فکر میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں تو پھر ان کو مشکوک پھر صحیح ثابت کرنے سے اس فکر کی مقام واہمیت کم ہو جائے گی۔جہاں تک امام غزالی کے تنقید سے متعلق اصولوں کا تعلق ہے۔تو اس لازمی تنقید کو تین زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے اول امام نہایت قطعیت کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں۔اسلام کے عقائد واعمال میں سے کچھ بھی ان نام نہاد دنیاوی حقائق سے متصادم نہیں ہے۔

منطقی تنقید کسی بھی نظریے کے منطقی ربط سے منسلک ہوتی ہے۔نظریے کا اندرونی ربط اس کی حقانیت کی دلالت کرتا ہے جب اس کی بے ربطگی اس کو جھوٹا ثابت کرتی ہے۔تہافہ میں امام نے منطقی طریق استدلال کو استعمال کرتے ہوئے یونانی فکر وفلسفہ کی بنیادی بے ربطگی کو ظاہر کیا ہے۔

امام کے خیال میں عقلی سطح ہی کسی مقام کی منطقی لزومیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لہٰذا تہافہ میں

اپنے جوابی دلائل میں انھوں نے بار بار اپنے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ وہ امام کے پیش کردہ قیاسی متبادل کے متضاد خیالات میں کسی بھی قسم کی خود تضادی تلاش کریں وہ کہتے ہیں کہ عقلی بنیاد پر فلاسفہ اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔امام غزالی بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ:

''کیا چیز ہمیں ان چیزوں پر یقین کرنے سے دور رکھتی ہے نیز اس میں کیا تضادات پائے جاتے ہیں''۔[Tp.16]

امام قانون تضاد کو یونانی فلاسفہ کے اندر موجود بے ربطگی کو ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

''آپ کہتے ہیں کہ زحل کی گردش سورج کی گردش سے تیس گنا کم ہے اور دونوں یکساں طور پر لامحدود ہیں۔ پھر کس طرح محدود اور لامحدود کے دو مقام ایک ہی چیز اور وقت کے لیے ہو سکتے ہیں۔کیا یہ چیز کسی فرد کو مایوس کن خود تضادی کا شکار نہیں کر دے گی۔ان فلاسفہ کے بارے میں اس دلیل کو ناکافی سمجھتے ہوئے امام نے ان فلاسفہ کی خود تضادی اور بودے پن کو مزید واضح کیا ہے۔

دوسری طرف امام غزالی نے یونانی فلاسفہ اور یونانی علوم کے حاصل کردہ تاریخی حقائق کے درمیان تناؤ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔انھوں نے یونانی فلسفہ کے ابدیت کے نظریہ اور یونانی طبیعیات اور فلکیات کے کائناتی اشیاء کی خاص تعداد میں گردش کے نظریۂ پر بھی نکتہ چینی کی۔وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے مخالفین کو کس طرح رد کر سکتے ہیں جب وہ کہتے ہوں کہ دنیا کی ابدیت ناممکن ہے۔

لازمی تنقید کے ضمن میں امام غزالی اسلام اور یونانی فلسفہ کے اس بنیادی اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اختلافات مابعد الطبیعیاتی یا محض اعداد و شمار کے نہیں ہیں جن کو حقائق کی بنیاد پر حل کر لیا جائے۔امام فرماتے ہیں''ایک مذہبی آدمی اور فلسفی کے درمیان تنازعہ محض دنیا کے فانی یا غیر فانی ہونے پر نہیں ہے اگر دنیا کی ابتداء کے وقت کا تنازعہ حل ہو جائے تو دنیا کے گول، چوکور یا شش پہلو یا ہشت پہلو ہونے پر اور زمین کی تہوں پر اختلافات ہو جائیں گے۔اس طرح حقائق کی تحقیق مابعد الطبیعیاتی تحقیق سے متعلق نہیں ہے۔ ہماری دلچسپی کا موضوع یہ ہے کہ دنیا خدا کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے خواہ یہ عمل کسی طرح بھی انجام پایا ہو۔امام کہتے ہیں:

''کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کائنات کی گردش جفت یا طاق ہے اگر آپ اس کو جفت اور طاق دونوں کہیں گے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہ تو جفت ہے اور نہ طاق، یہ بے ہنگم بات ہے۔اگر آپ اسے جفت کہیں تو محض ایک کا اضافہ اسے طاق بنا دے گا اور اگر آپ طاق کہیں گے تو ایک کا اضافہ اسے جفت بنا دے گا ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز جو لامحدود ہے محض ایک عدد کے اضافہ سے جفت سے طاق بن جائے یعنی آپ کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ عدد نہ تو جفت ہے نہ ہی طاق''۔یہ خود تضادی کی ایک شاندار مثال ہے۔

د)لازمی تنقید میں ہم ساختی دلیل استعمال کرتے ہیں جو کہ تاریخی یا حقیقی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔اس طریقہ تنقید کو ہم کسی نظریے کے حقیقی نقائص کو تلاش کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔امام کے اصول تنقید کے حوالے سے ہم لازمی تنقید کو

تین حوالوں سے دیکھ سکتے ہیں۔سب سے پہلے امام غزالی غیر مبہم انداز میں واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں کوئی عمل متضاد یا مبہم نہیں ہے۔تہافہ کے تمہیدی باب میں امام اس بات کو کلی طور پر رد کرتے ہیں کہ بعض احادیث حقیقت سے متصادم ہیں، ان احادیث کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ ناجائز اضافے ہیں، ہمیں اس کے مصنف کو جھوٹا سمجھتے ہوئے اس کی ملامت کرنی چاہیے۔رسول کے الفاظ صرف وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔اگر یہ اضافے اصل میں تو ان کی وضاحت کی ضرورت ہے نہ کہ ان کو حقائق برخلاف ثابت کرنے کی۔

حرف آخر:

تنقید کی پوری حکمت عملی کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی ہے۔

☆ گمراہ اقلیت کو ان کے داخلی خیالات کی بے ربطگی واضح کر کے مسترد کیا جائے اور یہ کام لازمی خارجیت کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک حد تک نفوذ کے ذریعے ممکن ہے۔

☆ داخلی تنقید اسلام کی حقانیت کے ایک واضح پیکر میں مضبوط عقیدے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔

☆ یکسانیت کو نمایاں کر کے اللہ اور آخرت کے بنیادی تصور کے لیے راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

بلاشبہ یہ تنقید اس تمام مثبت کام پر ایک ابتدائی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس مقالے میں وسعت نہیں کہ وہ اس تمام کام کو سمیٹ سکے۔